شبیہ پیغمبرؐ حضرت علی اکبرؑ

اللھم اشھد علی ھؤلآء القوم فقد برز الیھم غلام اشبه الناس خلقاً و خلقاً و منطقاً برسولك کنا اذا اشتقنا الی نبیك نظرنا الی وجھه۔

''بار الٰہا! گواہ رہنا کہ اس قوم کی طرف اب وہ فرزند جارہا ہے جو خلق اور خلق اور گفتار میں سب سے زیادہ تیرے رسولؐ سے مشابہ ہے اور جب ہم تیرے نبیؐ کی زیارت کے مشتاق ہوتے تھے تو اس کی صورت دیکھ لیتے تھے۔

عاشور محرم ۶۱ھ کو کربلا کی سرزمین پر جہاں مسلمان اور کافر کی جنگ نہیں بلکہ نمائشی مسلمانوں اور حقیقی موحدین کے درمیان حقیقت اسلام کا فیصلہ کن معرکہ گرم تھا، یہ الفاظ اس وقت ایک بوڑھے باپ کی زبان پر جاری تھے جب وہ اپنے جوان فرزند کو قربان گاہ کے لئے رخصت کررہا تھا۔

تاریخ کے طالب علم کو جس نے دنیا کی بہت سی لڑائیوں کے واقعات پڑھے ہوں گے بیشتر خون آشام جنگوں میں باپ بیٹے کے بچھڑنے کے واقعات بھی ملے ہوں گے، کتنا ہی مردمیدان ہو لیکن بیٹے کی جدائی پر باپ کا اضطراب، دل کی بے چینی، حسرتوں اور مرادوں کی بربادی پر اظہار قلق کے مظاہرے ضرور ملیں گے لیکن کربلا کا جہاد اپنی خصوصیات کے اعتبار سے عجیب وغریب معرکہ تھا۔ خدا کی راہ میں سرفروشوں کی مختصر سی فوج کا سالار، رسولؐ کا نواسہ، علیؑ کا دلبند فاطمہؑ کا فرزند اور حسنؑ مجتبیٰ کا قوت بازو حسینؑ اس جہاد کو جذبات سے بلند، خواہشات نفسانی سے بالاتر اور ثبات قدم کے اعلیٰ معیار پر دنیا کے سامنے پیش کررہا تھا جہاں انسانی تصور کام نہیں کرسکتا۔

شاعرِ حسینیت جناب سید محمد اطہر صاحب زائرؔ سیتاپوری

رخصت کرتے وقت جو الفاظ بطور مناجات حضرت سیدالشہداء کی زبان پر جاری ہوئے ان کا ادا کرنا خطابت اور شاعری کے موقع پر تو آسان ہے لیکن عالم وقوع میں اس اہم وقت پر جس طرح جاری ہوئے ان کی نظیر اور کہیں تو درکنار اسلام کی کسی جنگ میں بھی نہ عہد رسالت میں ملتی ہے اور نہ عہد امیرالمومنین علی ابن ابی طالبؑ میں۔

پہلے موازنہ کیجئے ان الفاظ کا اسی کربلا میں اور اسی عاشور محرم کو آغاز جنگ کے وقت سپہ سالار یزید یعنی عمر ابن سعد کے ان الفاظ سے جن میں اس نے اپنی فوج کو مخاطب کرکے کہا تھا کہ'' گواہ رہنا سب سے پہلا تیر لشکر حسینؑ کی طرف میں پھینک رہا ہوں اور یہیں سے مقاصد جنگ اور ان کی مرکزیت پر غور فرمایئے کہ جس شخص کا مقصد اول وآخر، خوشنودی بادشاہ وقت تھا اس نے اپنی فوج کو گواہ بنایا کہ اس کے افراد بادشاہ کے سامنے سپہ سالار کی سبقت اور وفاداری کی گواہی دیں اور پھر حضرت سید الشہداؑ کا نقطۂ نظر ملاحظہ فرمایئے۔

وہ دنیا والوں کو بھی گواہ کرسکتے تھے اور کہہ سکتے تھے کہ صرف اس وقت کے لوگ نہیں بلکہ آئندہ آنے والی نسلیں بھی گواہ ہوجائیں کہ میرا یہ فرزند ہم شبیہ رسولؐ ہے مگر خدا کو گواہ کرکے بچے کو میدان جنگ میں بھیجنا اس کی دلیل ہے کہ یہ جہاد دنیا کی کسی فرد کی خوشنودی کے لئے نہیں ہورہا ہے بلکہ رضائے الٰہی متصور ہے اور وہی حسینؑ ابن علیؑ کا مرکز ہے۔

پھر اصحاب باوفا کے مسلسل کام آنے پر یہ کوئی بعد کی سوچی ہوئی بات نہ تھی بلکہ لشکر دشمن سے تیر آنے سے پہلے ہی جو مناجات

صبح عاشور کے تاریخی خطبے سے پیشتر حضرت سید الشہدؑانے زبان پر جاری فرمائی تھی وہ یہ ہے۔

''بار الٰہا! ہر مصیبت میں تو میرا سہارا ہے اور ہر سختی میں میرا قبلۂ امید ہے اور تیرے ہی اوپر مجھے ہر مہم میں بھروسہ ہے۔ کتنے ہی ایسے صدمے ہوتے ہیں جن کو برداشت کرنے سے دل کمزور ثابت ہوتا ہے اور راہ چارہ وتدبیر مسدود نظر آتی ہے، دوست ان میں ساتھ چھوڑ دیتے ہیں اور دشمن طعنہ زنی کرتے ہیں، میں ان کو تیری بارگاہ میں پیش کر کے عرض حال کرتا ہوں اس لئے کہ میں تجھے چھوڑ کر کسی اور سے لو لگانا جانتا ہی نہیں، تو میری اس مصیبت میں مدد کرتا ہے۔ یقینا تو ہی ہر نعمت کا مالک اور احسان کا مرکز اور ہر امید کے لئے منزل آخر ہے۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ شروع ہی سے حضرت کا نقطہ نظر دوسرا ہے اور آپ کی جنگ عام لڑائیوں سے نوعیت کے اعتبار سے بالکل الگ ہے اگر صرف مدینہ سے کربلا تک کے جو حالات کتابوں میں ملتے ہیں غور سے پڑھے جائیں تو اس بات کا بین ثبوت مل جائے گا کہ حضرت سید الشہدؑاءاور خود آپ ہی تنہا نہیں بلکہ آپ کے اصحاب واقربا سب ہی ایک سمجھے بوجھے ہوئے مسلک پر گامزن تھے۔

افسوس ہے کہ تاریخ نے اتنے اہم واقعات کو تفصیل سے بیان نہیں کیا اور بیان بھی کیوں کرتی جبکہ ان کے چھپانے کے لئے حکومتوں کے جبر وتشدد اور مکر وفریب کی پوری مشنری مسلسل حرکت میں رہی ہو۔ ان صورتوں میں جب خود حضرت امام حسینؑ کی سیرت کے نقش ونگار پورے طور پر صفحات تاریخ پر نہ آسکے دوسرے شہداء کے اذکار کیوں کر تفصیل سے بیان ہو سکتے تھے۔

حضرت امام حسینؑ کے لئے یہ بڑا دل شکن حادثہ ہوتا کہ اتنی گراں بہا قربانیوں کے باوجود واقعہ کربلا زینت طاق نسیاں بن جاتا لہٰذا حضرت نے عجیب عجیب حکیمانہ انداز اختیار فرمائے۔ عورتوں بچوں کا ساتھ لینا، بھرے مجمع میں بیشتر مقامات پر خطبہ ارشاد فرمانا اور کبھی تحریری صورت میں اپنے ارشاد گرامی کو مجمع تک پہنچانا، بعض وفاداروں کو برابر ساتھ رہنے کی اجازت دینا، اصحاب اور اقربا کی رخصت اور شہادت کے موقع پر اپنے تاثرات کا اظہار فرمانا وغیرہ۔ یہ سب اسی لئے تھا کہ ضروری ضروری باتیں اس طرح کہہ دی جائیں جن کو بعد میں دنیا سوچ سکے اور سمجھنے کی کوشش کرے۔ تقریروں اور تحریروں میں مقاصد جنگ سے لے کر ان شخصیتوں تک کے خصوصیات کا تذکرہ ہے جو حضرت کی طرف سے جہاد میں کسی نہ کسی طرح شریک تھیں۔

وہ مناجات جو میرا سرنامہ مضمون ہے ہم شبیہ پیغمبر جناب علی اکبرؑ کی رخصت کے موقع پر حضرت نے فرمائی ہے چند الفاظ ہیں جن کے اندر معانی اور مطالب کا بحر ناپیدا کنار ہے۔ کسی اور نے عام نگاہوں میں اطمینان وسکون کے موقع پر یہ الفاظ کہے ہوتے تو ان میں بہت کچھ عبارت آرائی کی تہمت کا اندیشہ تھا لیکن موقع ومحل دیکھئے اور کہنے والے کی شخصیت ملاحظہ فرمائیے جس نے صبح عاشور والے تاریخی خطبہ میں پوری فوج دشمن کے سامنے پکار کر کہا تھا کہ:۔

''......کبھی میں نے غلط بات نہیں کہی۔''

اور کوئی بھی ایک متنفس ایسا نہ تھا جو اس کو جھٹلانے کی جرأت کرتا۔

یہ بھی ممکن تھا کہ یہ مناجات حضرت علی اکبرؑ کی شہادت پر فرمائی جاتی لیکن غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت فتح کے نشہ میں دشمن اس کو سنتا کیوں کر؟ اس وقت کے لئے تو جو کچھ واردات قلبی کا نقشہ ''علی الدنیا بعدک العفا'''' کے دلدوز مرثیہ میں ہے اس کو اس مناجات کے ساتھ ملا کر پڑھیئے تو درد وغم کی داستان بلند سے بلند تر معلوم ہوگی۔

بیشک رخصت کرتے وقت حضرت کا ارشاد گرامی، سوانح حیات جناب علی اکبرؑ کا ایک اجمالی دفتر تھا، دشمن کی فوج منتظر تھی کہ اب کون جنگ کے لئے آتا ہے؟ سب کی نگاہیں خیام حسینی کی جانب ہوں گی، خیمے کے اندر کہرام تھا جیسے بھرے گھر سے جنازہ نکل رہا ہو۔ کبھی پردہ گرتا تھا کبھی اٹھتا تھا اور یہ امر مزید باعث توجہ بن گیا تھا لشکر دشمن کے لئے کہ اب آنے والا گھر بھر کی جان ہے۔

رسولؐ کی وفات کو صرف پچاس برس کا عرصہ گذرا تھا اور اگر سپاہ یزید میں کوئی نام نہاد صحابی رسولؐ نہ بھی موجود ہو تب بھی پیغمبرؐ اسلام کا جمال جہاں آرا اور حضور کے خصوصیات (گو ظاہری طور پر سہی) مسلمانوں کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہوئے تھے اور امام حسینؑ کو اسی جانب ان کی نگاہ موڑنا تھی۔

حضرت سیدا الشہدؑا نے اس مناجات کے ایک ایک لفظ میں معانی و مطالب کے وہ خزانے بھر دیئے ہیں جو حضرت ہی کے لئے ممکن تھا، قرآن کی زبان، وحی کے زمزمے اور "اوتیت جوامع الکلم" کا مرقع!

ابتدا ہوتی ہے "اللہم" سے۔

قرآن کا غائر مطالعہ فرمایئے اور ان دعاؤں کو دیکھئے جن کو کلام پاک نے بطور تعلیم یا بطور اظہار واقعہ ذکر کیا ہے جب کبھی کسی بندے کی جانب سے کچھ طلب ہوا تو ابتدا ہوئی فقط "رب" سے مثلاً رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ الخ۔ رَبَّنَا آتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّفِی الآخِرَةِ حَسَنَه۔

لیکن جب صرف ذات وصفات احدیت کا تذکرہ منظور ہوا اور مرکوز خاطر اسی تذکرہ کے پردے میں رہا تو "اللہم" کے الفاظ صرف ہوئے جیسے "اللهم" مالك الملك الخ۔

حضرت سیدا لشہدؑا نے "اللهم" سے ابتدا کر کے حضرت علی اکبرؑ کے صرف خصوصیات و کمالات کو بیان فرمایا اور قلبی کیفیت کو سمو دیا اسی تذکرہ میں، کوئی شبہ نہیں کہ ایک ایک حرف میں حقیقی اور فطری محبت کی چمک دمک ہے لیکن وہ محبت صفات و کمالات کی ہے صرف باپ سے بیٹے کی موانست نہیں ہے۔

دوسرا لفظ جو ہماری توجہ خصوصی طور پر اپنی جانب مبذول کرتا ہے لفظ "غلام" ہے۔ ظاہر ہے کہ حضرت "ابنی" بھی فرما سکتے تھے جس کے معنی ہیں "میرا بیٹا" اور حضرت علی اکبرؑ کی شہادت کے موقع پر "یا بنی" کے الفاظ استعمال بھی فرمائے اس طرح کہ "قتل اللہ قوماً قتلوک یا بنی ــــــــ" لیکن غلام کے لفظ سے حضرت زکرؑیا کی جانب اس بشارت کا لطیف اشارہ معلوم ہوتا ہے جس میں جناب یحیٰؑ کے پیدا ہونے کا ذکر ہے اور اس سے زائد توجہ اس بشارت کی جانب مبذول ہوتی ہے جو حضرت ابراہیمؑ خلیل اللہ کو ولادت حضرت اسمٰعیلؑ کے لئے "وَبَشَّرْنَاہُ بِغُلَامٍ حَلِیْمٍ" کے الفاظ میں قرآن کے اندر موجود ہے۔ اس سے میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ جیسے جناب یحیٰ کی ولادت حضرت زکریا کے سن کہولیت کی وجہ سے ایک خاص ندرت کی حامل تھی وہی صورت یہاں بھی تھی بلکہ جو محبت حضور پیغمبرؐ اسلام کو حضرت امام حسینؑ سے تھی اور جو اس نواسے کو نانا سے تھی اس کا تقاضا یہ تھا کہ سیدالشہداءؑ کو آنکھوں میں ہر وقت نانا کی صورت اور دل میں آنحضرت کی یاد رکھنے کے ساتھ ساتھ یہ خواہش اور تمنا رہے کہ گھر میں ایک جیتی جاگتی تصویر بھی نانا کی ہو اور حضرت علی اکبرؑ بطور تسکین قلب حسینی اور عطیہ باری کے اس دنیا میں تشریف لائے۔ اس کو ایک دوسرے کے انداز میں ہمارے سیتاپور کے باکمال مرثیہ گو جناب فارؔغ مرحوم شاگرد حضرت انیسؔ نے ایک بیت میں یوں کہا ہے ؎

دل میں احمدؐ کے تصور نے زبس گھر پایا
لال شبیرؑ نے ہمشکل پیمبر پایا

لیکن ولادت حضرت اسمٰعیلؑ کے واقعہ کا بالکل سیدھا رخ ہے اس خانوادہ رسالتؐ کی جانب!

حضرت اسمٰعیلؑ کا ذبح ہونا وَفَدَیْنَاهُ بِذِبْحٍ عَظِیْمٍ کی خبر، اور نسل اسمٰعیلؑ سے حضور سرور کائناتؐ کا پیدا ہونا، پھر ذبح عظیم کی مکمل تفسیر کا کربلا کے میدان میں نگاہوں کے سامنے آنا، ان سب امور کے پیش نظر "غلام" کے لفظ کا استعمال اس مسلسل تاریخ کا ایک مرکز توجہ بنتا ہے جس کے مختصر اجزاء بھی اس مضمون میں نہیں سما سکتے۔ تاریخ ابراہیمی قرآن کی زبان میں ملاحظہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ لفظ "غلام" اور لفظ "ابن" کا استعمال کن کن مواقع پر ہوا ہے اور کربلا میں حضرت امام حسینؑ نے اس تاریخ کو کیوں کر دہرایا ہے اور کیا حسن ادا ہے مطالب کا!

اس کے بعد تین لفظ حضرت علی اکبرؑ کے بارے میں اور

ہیں خَلق، خُلق، اور منطق۔

خَلق

حضور ختمی مرتبت احمد مجتبیٰ محمد مصطفیؐ کی خلقت سے تشبیہ بڑی عظیم المرتبت خصوصیت ہے۔ نگاہ دوربین ''اول ما خلق اللہ نوری'' پر جمتی ہے اور پھر ٹھٹھک جاتی ہے اور شہزادہ علی اکبرؑ کے جمال و کمال کے نقش و نگار دیکھ کر نگاہیں خیرہ ہونے لگتی ہیں، بڑی سخت منزل ہے، جہاں نور ہی نور ہے اور نظر جستجو کو جیسے کوئی آواز دیتا ہے کہ ''لن ترانی'' (نہیں دیکھ سکتے) نگاہیں پلٹ آتی ہیں اور مناجات کے دولفظوں پر ٹھہر جاتی ہیں۔

''برسولک'' تیرے رسولؐ کے ساتھ۔

بنبیک تیرا نبی۔

آخر یہ دولفظ جدا جدا استعمال کیوں کئے گئے؟ رسولؐ کہا تھا تو نبیؐ نہ کہا ہوتا یا ابتداء ہی میں نبی کہہ دیا ہوتا؟ مگر معلوم ایسا ہوتا ہے کہ تشبیہ کا تعلق اس عہد سے ہے جب سے رسالت کے حدود کا تعلق ہے وہ قید زمان و مکان سے بلند ہے خود ارشاد فرمایا ہے۔

کنت نبیاً لآدم بین الماء والطین

(میں اس وقت بھی نبی تھا جب آدمؑ مابین آب و گل تھے)

اس کے معنی یہ کسی طرح نہیں ہیں کہ وہ وقت آغاز نبوت کا تھا بلکہ بنی آدم جب سے اپنی ابتدا سوچے تو اس کو یہ معلوم ہے کہ اس وقت بھی آنحضرت نبی تھے، کب سے تھے؟ یہ اس حدیث نے بھی پردے میں رکھا۔ ہاں رسالت کا عہد وہ سمجھا جاسکتا ہے جب آپ نے عالم ظاہر میں ''حکم الٰہی پہنچانے کا فریضہ انجام دیا۔'' ایسی صورت میں اس تشبیہ کا تعلق آنحضرت کے دنیا میں تشریف رکھنے سے ہوگا۔ کوئی شبہہ نہیں کہ اس سے بھی ولادت جناب علی اکبرؑ میں ہر قسم کی طہارت پاکیزگی اور بلندی کی شباہت حضور سرور کائنات سے پائی جاتی ہے اور اصلاب شامخہ (بلند صلبوں) اور ارحام مطہرہ (پاکیزہ شکموں) سے شاہزادے کا عالم وجود میں آنا تو تاریخی حقیقت ہے۔

باپ: حضرت سید الشہداؑ امام حسینؑ ابن علیؑ ابن ابی طالب علیہم السلام۔

ماں: جناب لیلیٰ بنت ابی مرہ ثقفی جو ایمان و ایقان کی ان منزلوں پر فائز تھیں کہ باوجود یکہ ایک طرح سے بنی امیہ سے آپ کا تعلق قرابتداری بھی تھا اور آپ معاویہ ابن ابی سفیان کی بھانجی اور یزید کی پھوپھی زاد بہن تھیں لیکن کہیں کوئی کمزور روایت بھی نہیں ملتی کہ کوئی رغبت آپ کو ان لوگوں سے رہی ہو یا یزید کی یہ ہمت پڑی ہو کہ قید شام ہی میں آپ کے ساتھ کوئی رعایت کرنے کا خیال ظاہر کرتا، اس کے معنی یہ ہوئے کہ جناب لیلیٰ مسلمہ طور پر اپنے مسلک میں اتنی مستحکم تھیں کہ باطل کسی ترغیب و تحریص کو سوچنے کی بھی جرأت نہیں کرسکتا تھا۔ ایسا بھی نہیں تھا کہ جہاد کربلا کے سلسلے میں اس قسم کے سیاسی کرتب نہ دکھائے گئے ہوں لیکن عبداللہ ابن ابی محل اور خود شمر کی مکاری کا جواب حضرت عباس علیہ السلام اور ان کے بھائیوں کی جانب سے میدان کربلا میں مل چکا تھا اور سب نے سمجھ لیا تھا کہ یہ حضرات وہ ثبات قدم رکھتے ہیں جن میں تزلزل ناممکن ہے۔

خلق کا ترجمہ عام طور پر صورت کیا جاتا ہے اور یہ بھی ایک متفق علیہ حقیقت ہے کہ شاہزادہ علی اکبرؑ شکل و شمائل اور چال ڈھال میں سب سے زیادہ شباہت رکھتے تھے حضور سرور کائناتؐ سے۔ آپ ایک زندہ تصویر تھے پیغمبرؐ اسلام کی اور واقعہ کربلا کی یہ ایک اہم خصوصیت تھی کہ وہاں سرور کائناتؐ کا گویا ایک زندہ مجسمہ تھا جو اپنے اسلام کے اصلی خدوخال نمایاں کرنے کے لئے ہر قربانی کے لئے تیار تھا۔

خُلق

اس کے معنی ہیں سیرت اور کردار کے، شاہزادے کو مشابہت دی جارہی ہے اس رسولؐ سے جس کے لئے قرآن کی نص ہے کہ ''انک لعلیٰ خلقٍ عظیم'' اے رسول آپ اخلاق کے عظیم درجہ پر فائز ہیں۔

حضرت محمد مصطفیؐ کی ذات والا صفات عالم امکان میں سب سے بلند اور ممکنات کا نقطہ آخر ہے۔ سیرت اور کردار کا تعلق

خود ذات واجب الوجود ہے ۔ اس طرح پیدا نہیں ہوتا کہ ان چیزوں کاظہورلازمہ ہے مادیت کااورذات واجب میں یہ ناممکن، قرآن کوغور سے پڑھنے سے معلوم ہوتاہے کہ ذات احدیت کی ''اطاعت'' تو ہوسکتی ہے لیکن کہیں اس کے''اتباع'' کاحکم نہیں ہے۔''اتباع''ہمیشہ رسولؐ کا ہوگا کیونکہ اس کی سیرت نمونہ عمل بن سکتی ہے لہٰذا اس شعبہ میں کسی نہج سے کوئی ہستی حضرت رسولؐ اسلام سے بلند نہیں ہے۔اب ذرا شاہزادے کی رفعت اورعلوئے مرتبت اخلاق کی دنیا میں دیکھئے جہاں عصمت ، نبوت ، رسالت، خلت اورامامت اگراللہ کے دوسرے خاص بندوں کوعطانہ ہوچکی ہوتی جوبجز ذات محمدیؐ کے اس شاہزادے سے کوئی بلندنظر نہ آتا۔

شاہزادے کی عمر ہی کیا ہوئی ؟ اٹھارہ برس کا سن اوراس پر یہ جلالت قدر! اصلاحی طور پر بھی ثابت ہوتب بھی کون ایسا واقعہ ملتاہے جس سے جناب علی اکبرؑ کی سیرت وکردار پر معاذ اللہ حرف زنی کی جائے پھر اگر حد بلوغ کو نہ پہنچے ہوتے تب یہ کہا جاسکتا تھا کہ تکلیف شرعی جاری ہی نہیں ہوئی لیکن کم سے کم اٹھارہ سال کی عمر تو مانی ہی جاتی ہے اورصفات وکردار میں اتنی بلندی کہ دوست دشمن سب ہی معترف ! دربار شام کا واقعہ جو معاویہ ابن ابی سفیان کے عہد میں گذرا تاریخ کے صفحات پر موجود ہے خود امیرشام نے کہا کہ:۔

''سب سے زیادہ مستحق خلافت حسینؑ کےفرزند علیؑ ہیں جن کے دادا رسولؐ اللہ تھے ان میں بنی ہاشم کی شجاعت ، بنی امیہ کی سخاوت اورقبیلہ ثقیف کی خودداری کے اوصاف یکجا موجود ہیں۔

شجاعت ،سخاوت اورخودداری یہ سب کمالات انسانی ہیں جن کے بارے میں خواہ مخواہ کوئی رائے نہیں دیتا ہے جب تک ان کا مظاہرہ نہ ہو۔کاش تاریخ نے واقعات کوتفصیل کے ساتھ بیان کیا ہوتا!

معاویہ ابن سفیان جس ذہنیت کے آدمی تھے اس کا اندازہ ان کے حالات پڑھنے سے ہوتا ہے ظاہری جاہ وحشمت اور طمطراق کے وہ دلدادہ تھے لہٰذا بہت زیادہ نگاہ بلند کرنے کے بعد بھی انہیں شاہزادے کی حق پرستی لائق ذکر نہ معلوم ہوئی حالانکہ یہ عنصر اسلامی خلافت کے لئے سب سے زیادہ قابل لحاظ تھا۔اور حضرت علی اکبرؑ کی سیرت کا یہی سب سے اہم جز وتھا۔اتفاق یہ ہے کہ تاریخ نے بھی ایک واقعہ ہمارے سامنے پیش کیا ہے جس سے پوری روشنی اس خصوصیت پر پڑتی ہے، مکہ سے کربلا جاتے ہوئے قصر بنی مقاتل سے قافلہ اہلبیتؑ آگے بڑھ چکا ہے، ابھی کچھ راستہ طے ہوا تھا کہ حضرت امام حسینؑ پر کچھ غنودگی سی طاری ہوئی، آنکھ کھلی تو آپ کی زبان پر کلمۂ''**اناللہ وانا الیہ راجعون**'' جاری تھا اس وقت حضرت علی اکبرؑ گھوڑا بڑھا کر آپ کے پاس آئے اور یہ کلمات ارشادفرمانے کا سبب پوچھا۔حضرت نے فرمایا کہ''ابھی میری آنکھ لگ گئی تھی، میں نے ایک سوارکودیکھا جو یہ کہہ رہا تھا کہ یہ لوگ راستہ طے کررہے ہیں اورموت ان کی طرف آرہی ہے حضرت نے فرمایا کہ''میں سمجھتا ہوں کہ اس طرح ہم کو ہماری موت کی اطلاع دی گئی ہے۔'' شاہزادے نے عرض کیا کہ'' بابا خدا آپ کورنج کی صورت نہ دکھائے کیا ہم حق پر نہیں ہیں؟'' حضرت نے فرمایا''اسی خدا کی قسم جس کی طرف سب کی بازگشت ہے ہم حق پر ہیں۔'' جناب علی اکبرؑ نے کہا کہ

''جب ہم حق پر ہیں تو پھر ہمیں موت کی کیا پرواہ ہے۔''

عرب نسلی طور پر جیالے ہوتے تھے، جان لینا اورمرجانا ان کے نزدیک کوئی بات ہی نہ تھی ۔ بنی ہاشم خودشجاعت میں ضرب المثل تھے چنانچہ معاویہ کوبھی اس خاندان میں یہ صفت سب سے زیادہ نمایاں معلوم ہوئی اور جناب علی اکبرؑ کے خصوصیات میں بنی ہاشم ہی سے منسوب کرکے اس کا ذکر انھوں نے حضرت علی اکبرؑ کے لئے کیا۔لیکن خواہ معاویہ نے اس کوسمجھ کے کہا ہو یا نہ کہا ہو، عام طور پر لڑ بھڑ کے مرنے یا مارڈالنے اور شجاعت میں فرق ہے۔ بے سمجھے بوجھے جوش اوراشتعال میں ہر جگہ برسرپیکار ہوجانا''تہور'' ہے''شجاعت''نہیں۔شجاعت تو نام ہے موقع اورمحل کے اعتبار سے صحیح جگہ پر اقدام جنگ کرنے کا۔ مگر قصر بنی مقاتل سے روانہ ہونے کے بعد جو واقعہ گذرا اورجس

کا ذکر میں نے اوپر کیا ہے اس میں حضرت علی اکبرؑ کا کمال یہ نہیں ہے، کہ آپ موت سے خائف نہیں ہوئے بلکہ شہزادے کی معراج سیرت نمایاں ہے اس فقرے سے کہ ''جب ہم حق پر ہیں تو پھر ہمیں موت کی کیا پرواہ ہے۔

مطلب صاف ہے کہ '' مرجانا'' تو عرب کے لئے کوئی بڑی بات ہی نہیں لیکن ہمارا زاویہ نظر ''حق'' ہے اور ہم صرف حق پر مرنا چاہتے ہیں اور جب ایسی موت آئے تو پھر کوئی فکر نہیں ہے یہ ہے حد فاصل دوسرے افراد اور حضرت علی اکبرؑ کے درمیان!

سرکار رسالت کی پوری سیرت کا مطالعہ کر کے غور فرمایئے ایک یہی حق پرستی تھی جس نے ہر نرم گرم کے مقابلہ کا حوصلہ حضرت میں باقی رکھا۔

اب حضرت علی اکبرؑ کو دیکھئے جو آئینہ اخلاق محمدیؐ ہیں، حق پرستی جس میں صداقت بہر صورت موجود ہے اس کا وہ عالم، شجاعت یہ کہ بقول علامہ مجلسی دشمن کثرت مقتولین کی وجہ سے چیخ اٹھے، اعلان حقیقت پر رجز کے اشعار گواہ، جن میں اپنا استحقاق جانشینی رسولؐ اور مخالف کی پستی کا ذکر کیا گیا ہے۔ جس وقت یہ رجز پڑھا جا رہا ہوگا ایسا معلوم ہوتا ہوگا کہ پیغمبرؐ اسلام اعلان نبوت فرما رہے ہیں۔

رجز میں اگر صرف رسول سے نسبت دی جاتی تو یہ وہی بات ہوتی جو معاویہ نے کہی تھی کہ ان کے دادا رسولؐ اللہ تھے لیکن یہاں تو ارشاد یہ ہے۔

انا علیؑ بن حسینؑ بن علی

نحن ورب البیت اولی بالنبی

میں ہوں علیؑ، حسینؑ کا فرزند، علی کا پوتا، رب کعبہ کی قسم سب سے زیادہ ہم کو پیغمبرؐ کی وراثت کا حق پہنچتا ہے۔

یہ اعلان تھا اپنے پدر بزرگوار اور جد امجد کے استحقاق کا۔ مخالف کی پستی اس سے بڑھ کر کیا ہوگی کہ علی اکبرؑ نے اس کو بے نیاز سلسلہ ازدواج قرار دیا۔

یہ رجز اپنی نوعیت میں منفرد تھا اور دوسرے شہداء کے یہاں یہ بات نہیں ملتی۔

منطق

یعنی گفتگو اگر بہ نظر غائر دیکھا جائے تو خَلق اور خُلق میں یہ بھی شامل ہے اور جب حضرت امام حسینؑ نے ''اشبہہ'' کہہ دیا تھا تو جہاں تک ظاہری شکل و شمائل و عادات اور طریقوں کا تعلق ہے۔ یہ بھی سمجھا جا سکتا تھا کہ گفتگو بھی رسولؐ سے مشابہ تھی لیکن حضرت امام حسینؑ گویا اس شہزادے کی سوانح حیات کا ایک ایسا مکمل خاکہ دنیا کے سامنے پیش کر رہے تھے کہ پھر کسی کو شباہت کے کسی رخ میں گفتگو کا محل باقی نہ رہے۔

یہ حضرت سید الشہداءؑ کے قرآن ناطق ہونے کا ایک ثبوت بھی تھا۔ قرآن نے حضرت رسالت مآب کے بارے میں ''انك لعلی خلق عظیم'' کہنے پر کب اکتفا کیا بلکہ ارشاد حضرت احدیت ہوا کہ ''مَایَنطِقُ عَنِ الْھَوٰی اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی یعنی یہ کہ وہ خواہش نفس سے کلام کرتے ہی نہیں جب تک وحی نہ آئے جس کا صاف مفہوم یہ بھی ہے کہ حضرت محمد مصطفیٰؐ جذبات و خواہشات نفس سے بلند ہیں اور بغیر مرضی الٰہی زبان بھی نہیں ہلا سکتے۔

بیشک بجائے ''نطقا'' کے ''منطقا'' کا لفظ رکھا گیا اور اس سے شاید وہ حد فاصل کھینچنا منظور تھی جو رسولؐ کی وحی اور غیر رسولؐ کے کلام میں امتیاز پیدا کردے۔ اب اس خصوصیت نبوت کے علاوہ گفتار میں شباہت کا درجہ ہر صورت سے ممکن ہے۔

شاہزادے کی گفتار لب و لہجہ اور لحن رسالت کے مظاہرے کسی بزم میں ہوئے ہوں میری نگاہ میں نہیں ہیں البتہ دو موقعے صفحات تاریخ پر موجود ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سید الشہداءؑ کا مخصوص اہتمام اس امر میں منظور تھا۔

سفر کربلا کے حالات پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ لشکر حسینیؑ کے عام طور پر موذن حجاج ابن مسروق جعفی تھے ان کا تذکرہ تاریخ میں ذو حسم کی پہاڑی کے پاس لشکر حر سے ملاقات کے موقع پر بھی پایا جاتا ہے اور قرینہ یہ بتاتا ہے کہ برابر یہی فرائض موذنی انجام دیتے رہے لیکن صبح عاشور کی نماز کے لئے حضرت علی اکبرؑ کو اذان دینے کا حکم ہوا۔

اللہ اکبر! وہ کربلا کا بن، فوجوں کا محاصرہ، تین دن کی بھوک پیاس، امکاناتِ صلح کا ختم ہوجانا، شب عاشور کی ہولناک ساعتوں کا گذر جانا، جنگ سر پر، پھر وہ ذوق عبادت، شوق جانبازی اور اس عالم میں شاہزادے کا خشک زبان سے آواز بلند کرنا، رسولؐ کا لب ولہجہ، وہی آواز، وہی زورِ حقانیت!

ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اپنے ثبوتِ حقانیت میں امام حسین علیہ السلام خود رسولؐ خدا کو پیش کر رہے تھے۔

دوسرا موقع وہی رجز کا تھا جس کا ذکر ہو چکا ہے، اس کا اعادہ کرنا مقصود نہیں لیکن زورِ بیان، آہنگ اور شان ادا جو حق گوئی، حق آموزی، حق کوشی اور حق پرستی کے شایان!

اندازِ گفتگو اور لب ولہجہ مل جانا تو عام طریقہ پر انسانوں میں ہوتا ہے لیکن اعلائے کلمۃ الحق میں ہم آہنگی اور آواز صداقت پر آواز دینا یہ وہ خصوصیت تھی جو صرف شاہزادے کی ذات سے وابستہ تھی۔

مجھے احساس ہے کہ بعض حلقوں میں میرا یہ مضمون اس طرح دیکھا جائے گا کہ لفظی موشگافیوں سے خواہ مخواہ طومار پر باندھا گیا ہے اور حقیقت اس قدر ہے کہ جناب علی اکبرؑ صرف جسمانی حیثیت سے جو حضرت مصطفیٰؐ سے بہت زیادہ مشابہ تھے لیکن جب مناجات کے الفاظ ''برسولك'' اور بنبیك میری نگاہ کے سامنے آتے ہیں تو میں غور کرتا ہوں کہ یہاں ''جد'' اور ''محمدؐ'' کے الفاظ بھی استعمال ہو سکتے تھے پھر اگر کسی دوسرے شخص کی زبان پر یہ کلمات جاری ہوتے تو میں سمجھتا کہ رو میں رسولؐ اور نبیؐ کہہ گیا لیکن خود مناجات کا طریقہ اور امامؑ کی زبان اس کی ضمانت ہیں کہ ہر لفظ سکون نفس اور اطمینان قلب کا آئینہ دار ہے یعنی رسولؐ اور نبیؐ کے لفظوں کے استعمال میں خود ایک ندرت ہے بایں معنیٰ کہ مشابہت کا تعلق لفظ رسولؐ سے رکھا گیا ہو کیونکہ وہ عالم ظاہر میں محسوس ہونے والی چیزیں تھیں اور رسولؐ ایک نمائندہ الٰہی ہوتا ہے جبکہ عالم ظاہر میں آجائے لیکن نبیؐ اور وہ بھی خاتم النبیینؐ کا ایسا نبی! جو ہمیشہ سے نبی تھا اور ہمیشہ رہے گا لہٰذا جب اشتیاق زیارت کا ذکر آیا تو نبی کہا گیا کیونکہ زیارت کرنے والا نقل سے اصل کی جانب اپنے احساسات اور ذوق نظارہ کو منعطف کر رہا ہے اور اس میں صورت شکل عادات واطوار رفتار وگفتار سب چیزیں رہنمائی کریں گی اصل کی رفعت اور بلندی کی طرف خواہ وہ ظاہری ہو یا باطنی، عام مشاہدے میں آسکتی ہو یا اس کے علاوہ، اور مجازی ہو یا حقیقی تصویر کا کمال یہی ہے کہ اس کو دیکھ کر وہ ہستی اپنے پورے خط وخال کے ساتھ نگاہوں میں پھرنے لگے جس کی وہ تصویر ہو۔

(ماخوذ از سرفراز لکھنؤ (شبیہ پیغمبر نمبر) محرم ۹۷ ۱۳ھ ص ۱۳۰ / سے ۱۳۶ /)

❁ ❁ ❁

(صفحہ ۴۸ / کا بقیہ۔۔۔۔۔۔۔۔)

(صفحہ ۴۸ / کا بقیہ۔۔۔۔۔۔۔۔)

ہمدردانِ مشن کا حلقہ ہر سال وسیع ہو رہا ہے اور یہ بات مشن اور ملت دونوں کے لئے ایک فال نیک ضرور کہی جا سکتی ہے لیکن اس ہمہ گیر توجہ اور دلچسپی کا اب بھی فقدان ہے جو ہر فرد قوم میں پیدا ہو جانا چاہئے تھی۔ مظلوم کے خون ناحق کی نشر وتبلیغ کا کام واقعی بہت عظیم ہے اور اسے جس پیمانہ تک بھی پہونچا دیا جائے پھر بھی کوششوں کی تنگی داماں کی شکایت رہ جائے گی۔ دنیا کی کتنی ایسی زبانیں ہیں جن میں مشن کے کسی ایک رسالہ کا بھی ترجمہ نہیں ہو سکا ہے۔ اور وہاں کی دنیا محمدؐ وآل محمدؐ کے تعارف سے محروم ہے۔ اگر مشن کے یہی چھوٹے چھوٹے رسالے ان زبانوں میں بھی منتقل ہو سکتے تو کتنا اچھا ہوتا۔ میرا مشورہ ہے کہ اگر مشن نئے کتابچوں کے بجائے اب اپنے مفید اور مقبول رسائل کے تراجم کی طرف زیادہ توجہ دے تو یہ زیادہ مفید خدمت ہوگی۔ اس وقت کی پیاسی پریشان دنیا آبِ حیات کی تلاش میں ہر تختہ سراب کی طرف دوڑ جاتی ہے اگر واقعی اسے ایک ایسے سرچشمہ کی نشان دہی کر دی جائے جہاں ایک بار لب تر کر لینے کے بعد پھر ابداً تشنگی دور ہو جاتی ہے تو میرا دل گواہی دیتا ہے کہ پھر وہ ایسے ساحل مراد پر پہنچ کر وہاں سے ہٹنا کبھی پسند نہیں کرے گی۔ ہاں البتہ ان بدبختانِ ازلی کی اور بات ہے جو اسی شاخ کو کاٹ رہے ہیں جس پر خود بیٹھے ہوئے ہیں۔!!

(ماخوذ از سرفراز محرم نمبر لکھنؤ، ۸۳ ۱۳ھ، صفحہ ۱۱۱ /)

❁ ❁ ❁